موکش

انقلابی انسان کی تشکیل کا ابتدائی کلام

بشیر زیب بلوچ



موکش

انقلابی انسان کی تشکیل کا ابتدائی کلام

بشیر زیب بلوچ

تحریر: بشیر زیب بلوچ

کمانڈر انچیف بلوچ لبریشن آرمی

چھاپ: جنوری 2026

تعداد: دو ہزار



ہکّل پبلیکیشنز – بلوچ لبریشن آرمی

فہرست

حرف تمہید

میرے سنگتوں،

یہ کتاب کسی حکم نامے کی صورت میں تمہارے سامنے نہیں رکھی جا رہی، اور نہ ہی یہ محض تنظیمی آداب کی فہرست ہے۔ یہ ایک فکری اور نفسیاتی مکالمہ ہے جو تحریک اپنے کارکنان سے کرتی ہے، اور کارکن خود اپنے وجود سے۔ قومی آزادی کی جدوجہد صرف زمین، وسائل یا اقتدار کا سوال نہیں ہوتی۔ یہ سب سے پہلے انسان کی تشکیل نو کا سوال ہوتی ہے۔ اگر انسان وہی رہے جو استعماری سماج نے اسے بنایا تھا، تو آزادی محض پرچم کی تبدیلی رہ جاتی ہے۔

تحریکیں اس وقت کمزور نہیں ہوتیں جب ان پر دباؤ بڑھتا ہے، بلکہ اس وقت ٹوٹتی ہیں جب ان کے اندر غیر شعوری پن معمول بن جاتا ہے۔ جب نظم کو خوف سے جوڑا جائے، شعور کو جذبات سے بدل دیا جائے، اور سوال کو غداری

کا نام دے دیا جائے۔ اس کتاب کا مقصد کسی سنگت پر انگلی اٹھانا نہیں، بلکہ اس ذہنی ڈھانچے کو واضح کرنا ہے جس کے اندر رہ کر جدوجہد یا تو مضبوط بنتی ہے یا خود کو کھا جاتی ہے۔

سیاسی جدوجہد کی تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ طاقت صرف ہتھیار میں نہیں ہوتی، بلکہ معنی کی پیداوار میں ہوتی ہے۔ جو تحریک اپنے کارکن کو سوچنے، پرکھنے اور خود پر سوال اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی، وہ بالآخر خود ایک جامد نظام میں بدل جاتی ہے۔ اسی نکتے کی طرف انتونیو گرامشی نے اشارہ کیا تھا جب وہ بالادستی کو صرف طاقت نہیں بلکہ رضامندی کی تنظیم قرار دیتا ہے۔ اگر رضامندی غیر شعوری ہو، تو وہ آزادی نہیں، محض اطاعت ہوتی ہے۔

یہ کتاب سنگتوں کو یہ سکھانے نہیں آئی کہ کیا سوچنا ہے۔ یہ اس سوال کو مرکز میں لاتی ہے کہ سنگت سوچتا کیسے ہے۔ کیا اس کی وابستگی جذباتی ہے یا شعوری؟ کیا اس کا نظم خوف پر کھڑا ہے یا فہم پر؟ کیا وہ خود کو صرف مظلوم سمجھتا ہے یا ایک ذمہ دار فاعل؟ یہ سوالات نظری نہیں، بلکہ عملی ہیں۔ ان کے جواب سے ہی طے ہوتا ہے کہ تحریک آگے بڑھے گی یا اپنے ہی وزن تلے دب جائے گی۔

جدوجہد میں شامل ہر سنگت اپنے ساتھ ایک سماج اٹھا کر لاتا ہے۔ اس سماج کی زبان، اس کی عادتیں، اس کے تعصبات اور اس کی کمزوریاں بھی ساتھ آتی ہیں۔ آزادی کا عمل انہی باقیات کو توڑنے کا نام ہے۔ اسی لیئے فینن نے

نو آبادیاتی آزادی کو محض سیاسی عمل نہیں بلکہ نفسیاتی انقطاع قرار دیا تھا۔ جب تک غلامی ذہن میں زندہ رہے، آزادی کاغذ پر ہی رہتی ہے۔

یہ کتاب سنگتوں سے قربانی کا مطالبہ نہیں کرتی۔ قربانی یہاں پہلے ہی موجود ہے۔ یہ کتاب وضاحت کا مطالبہ کرتی ہے۔ وضاحت اپنی ترجیحات کی، اپنی کمزوریوں کی، اور اپنے کردار کی۔ یہاں کوئی ہیرو نہیں گھڑے جا رہے، کیونکہ تحریکیں ہیروز سے نہیں، کردار سے زندہ رہتی ہیں۔ اور کردار نظم، ضبط اور خود احتسابی سے بنتا ہے۔

آخر میں صرف یہ کہنا ہے کہ تحریکیں اس بات سے نہیں جانی جاتیں کہ انھوں نے دشمن کو کتنا نقصان پہنچایا، بلکہ اس بات سے پہچانی جاتی ہیں کہ انھوں نے اپنے انسان کو کتنا بدلا۔ اگر ہم باوقار، باشعور اور منظم انسان پیدا نہ کر سکے، تو کوئی بیانیہ، کوئی قربانی ہمیں تاریخ کے کٹہرے سے نہیں بچا سکے گی۔

یہ کتاب اسی شعور کی طرف ایک قدم ہے۔

سنگتوں کے ساتھ،

اور سنگتوں کیلئے۔

بشیر زیب بلوچ

انقلابی انسان کیا ہے، اور کیا نہیں

انقلابی انسان کسی واقعے کا ردعمل نہیں ہوتا۔ وہ کسی صدمے، کسی ظلم، یا کسی لمحاتی بغاوت کا عارضی نتیجہ نہیں۔ انقلابی انسان ایک وجودی انتخاب کا نام ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب انسان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ حالات کا پیدا کردہ کردار نہیں بنے گا بلکہ اپنی ذمہ داری خود اٹھائے گا، چاہے اس کی قیمت تنہائی ہو، خاموشی ہو، یا مسلسل داخلی کشمکش۔

انقلابی انسان سب سے پہلے اس فریب کو توڑتا ہے کہ اس کی زندگی کسی اور کے فیصلوں کی پیداوار ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ جبر کے نظام انسان کو صرف باہر سے نہیں توڑتے بلکہ اندر ایک ایسی ذہنی ساخت پیدا کر دیتے ہیں جو تاخیر، بہانے اور خود ترسی کو معمول بنا دیتی ہے۔ انقلابی انسان اس ساخت کو پہچانتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ آزادی سب سے پہلے ذہن میں یا تو جنم لیتی ہے یا مر جاتی ہے۔

انقلابی انسان خود کو حق کا مجسمہ نہیں سمجھتا۔ وہ جانتا ہے کہ حق پر ہونا انسان کو معصوم نہیں بناتا۔ بلکہ حق پر ہونا زیادہ سخت خود احتسابی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتا نہیں، مگر انہیں رومانوی بھی نہیں بناتا۔ وہ جانتا ہے کہ نفسیاتی مجبوری کو تسلیم کرنا ایک بات ہے، اور اسے مسلسل جواز بنانا وجودی بزدلی کی دوسری شکل۔

انقلابی انسان شور سے خوف کھاتا ہے، کیونکہ شور اکثر اندر کی خالی جگہوں کو ڈھانپنے کیلئے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ خاموشی کو کمزوری نہیں سمجھتا بلکہ خود سے مکالمے کی جگہ مانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو انسان خود سے سوال نہیں کرتا، وہ کسی نظام کو بھی حقیقی چیلنج نہیں دے سکتا۔

اسی ذمہ داری کو فرانز فینن نے اس جملے میں بیان کیا تھا کہ « ہر نسل کو اپنے تاریخی مشن کو دریافت کرنا ہوتا ہے، یا اسے پورا کرنا ہوتا ہے، یا پھر اس سے غداری کرنی ہوتی ہے۔ »

انقلابی انسان اس جملے کو تقدیر نہیں بلکہ سوال بناتا ہے۔ وہ ہر دن، ہر فیصلے اور ہر تاخیر کو اس سوال کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ غداری ہمیشہ دشمن کے ساتھ کھڑے ہو کر نہیں ہوتی، اکثر یہ خود سے سمجھوتے کی شکل میں ہوتی ہے۔ انقلابی انسان وہ نہیں جو اعلان کرے کہ وہ کون ہے، بلکہ وہ ہے جو خاموشی سے یہ ثابت کرے کہ وہ کیا بننے سے انکار کر چکا ہے۔

ذمہ داری کی نفسیات

بھول، تاخیر اور بہانے کیوں جنم لیتے ہیں

ذمہ داری سے پیچھے ہٹنا عموماً اخلاقی کمزوری سمجھ لیا جاتا ہے، مگر زیادہ تر یہ ایک نفسیاتی ردعمل ہوتا ہے۔ انسان اس وقت بھولتا ہے، تاخیر کرتا ہے یا بہانے بناتا ہے جب اس کے اندر ذمہ داری کے بوجھ اور اپنی نفسیاتی سکت کے درمیان عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ عدم توازن اکثر لاشعوری ہوتا ہے، اسی لیئے انسان اسے تسلیم کرنے کے بجائے جواز میں بدل دیتا ہے۔

مسلسل بھول یادداشت کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ یہ اکثر اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ انسان نے کام کو دل سے قبول نہیں کیا۔ جو کام انسان اپنی شناخت کا حصہ نہ بنائے، ذہن اس سے فاصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ تاخیر اسی فاصلے کی عملی شکل ہے۔ بہانہ اسی فاصلے کی زبان۔ انسان خود کو قائل کر لیتا ہے کہ حالات، تھکن یا مجبوری اصل وجہ ہیں، حالانکہ اصل مسئلہ اندر کی غیر واضح وابستگی

ہوتی ہے۔

انقلابی انسان اس نفسیاتی فریب کو پہچانتا ہے۔ وہ یہ مانتا ہے کہ ہر ذمہ داری خوشگوار نہیں ہوتی، مگر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ذمہ داری سے بھاگنا وقتی سکون تو دے سکتا ہے، مگر طویل مدت میں خود اعتمادی کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ہر ادھورا کام انسان کے اندر ایک خاموش اضطراب چھوڑ جاتا ہے، جو آہستہ آہستہ بے حسی میں بدل جاتا ہے۔

انسان ہر دن یہ انتخاب کرتا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کا بوجھ اٹھائے گا یا انہیں کسی اور کے کھاتے میں ڈال دے گا۔ یہی انتخاب اس کی نفسیاتی ساخت کو مضبوط یا کمزور بناتا ہے۔

اسی نکتے کو وکٹر فرینکل نے نہایت سادہ مگر گہری بات میں یوں سمویا تھا کہ «جب انسان کے پاس جینے کا مقصد ہو، وہ تقریباً ہر حالت کو برداشت کر لیتا ہے۔»

ذمہ داری تب بوجھ بنتی ہے جب مقصد مبہم ہو، اور مقصد تب مبہم ہوتا ہے جب انسان نے شعوری طور پر خود کو اس سے جوڑا نہ ہو۔ انقلابی انسان ذمہ داری کو خوف یا سزا سے نہیں بلکہ معنی سے جوڑتا ہے۔ وہ کام اس لیئے مکمل کرتا ہے کہ نامکمل رہنا اس کی داخلی ساخت کو توڑتا ہے۔ مسلسل غفلت، ٹال مٹول اور بہانے آخرکار تنظیم کو نہیں، سب سے پہلے انسان کو کمزور کرتے

ہیں۔ انقلابی تربیت کا مقصد اسی نفسیاتی کمزوری کو پہچان کر اسے ذمہ داری کی عادت میں بدلنا ہے۔

نظم و ضبط بطور خوف نہیں، بطور شعور

نظم و ضبط کو اکثر حکم، سزا اور نگرانی کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے، مگر یہ فہم سطحی ہے۔ خوف پر قائم نظم و ضبط عارضی ہوتا ہے۔ جیسے ہی نگرانی ختم ہوتی ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ انقلابی تربیت میں نظم و ضبط کا اصل منبع خوف نہیں بلکہ شعور ہوتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں انسان خود کو بیرونی آنکھ کے بغیر بھی جواب دہ محسوس کرتا ہے۔

نفسیاتی طور پر خوف انسان کو فوری عمل پر مجبور تو کر سکتا ہے، مگر وہ عمل اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ خوف انسان کو ذمہ داری کا بوجھ نہیں بلکہ اس سے فرار کے راستے سکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوف پر مبنی نظم و ضبط میں لوگ کام تو کرتے ہیں، مگر نیت کے بغیر۔ جیسے ہی موقع ملتا ہے، وہی نظم و ضبط بہانے، تاخیر اور لاپرواہی میں بدل جاتا ہے۔

شعور پر مبنی نظم و ضبط اس کے برعکس عمل کرتا ہے۔ یہاں انسان کسی کی نظر

سے نہیں بلکہ اپنے معیار سے بندھا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا ہر عمل صرف ایک کام نہیں بلکہ ایک پیغام ہے۔ اس پیغام کا پہلا مخاطب وہ خود ہوتا ہے۔ اسی لیئے وہ معمولی کام کو بھی معمولی نہیں سمجھتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ عادتیں ہی کردار بناتی ہیں۔

یہ نظم و ضبط انسان کو اندرونی استحکام دیتا ہے۔ وہ بار بار یہ سوال نہیں کرتا کہ مجھے کہا گیا ہے یا نہیں۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ کام میرے شعور کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہی نقطہ انقلابی نظم و ضبط کو فوجی اطاعت سے الگ کرتا ہے۔ یہاں اطاعت اندھی نہیں بلکہ سمجھی ہوئی ہوتی ہے۔

انسان ہر لمحہ یہ طے کرتا ہے کہ وہ اپنے عمل کا ذمہ دار خود ہوگا یا کسی نظام، فرد یا حالات کے پیچھے چھپ جائے گا۔ شعور پر مبنی نظم و ضبط دراصل اسی انتخاب کی مسلسل مشق ہے۔

اسی حقیقت کو انتونیو گرامشی نے یوں بیان کیا تھا کہ «انسان وہی ہے جو وہ خود کو بناتا ہے، نہ کہ وہ جو حالات اسے بناتے ہیں۔» انقلابی نظم و ضبط انسان کو یہی یاد دلاتا ہے کہ آزادی صرف مطالبہ نہیں، بوجھ بھی ہے۔ جو اس بوجھ کو شعور کے ساتھ اٹھاتا ہے، وہی حقیقی معنوں میں منظم ہوتا ہے۔ باقی سب محض نگرانی کے سہارے چلتے ہیں، اور نگرانی کبھی مستقل نہیں رہتی۔

انا، غرور اور خود مرکزیت کا انقلابی زوال

انا بذاتِ خود کوئی برائی نہیں۔ نفسیاتی طور پر انا انسان کو شناخت، خودی اور تسلسل دیتی ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انا مقصد سے بڑا ہو جائے، اور انسان جدوجہد کو اپنے وجود کی توسیع سمجھنے لگے۔ یہاں سے غرور جنم لیتا ہے، اور غرور وہ مرحلہ ہے جہاں انقلابی انسان آہستہ آہستہ خود مرکزیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی سطح پر خود مرکزیت ایک دفاعی کیفیت ہے۔ انسان جب اندرونی عدم تحفظ، کم اعتمادی یا غیر تسلیم شدہ خوف کے ساتھ جیتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر خود کو مرکز بنا لیتا ہے۔ وہ ہر اختلاف کو ذاتی حملہ، ہر تنقید کو توہین، اور ہر نظر انداز ہونے کو سازش سمجھنے لگتا ہے۔ اس کیفیت میں جدوجہد مقصد نہیں رہتی بلکہ انا کی تسکین کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

انقلابی انسان اس مقام پر خود کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ

جہاں انا فیصلہ کرنے لگے، وہاں شعور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ غرور اکثر قابلیت کی علامت نہیں بلکہ عدمِ تحفظ کا نقاب ہوتا ہے۔ اسلیئے وہ اپنی اہمیت کو خاموشی سے تحلیل کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اجتماعی جدوجہد میں خود کو بڑا ثابت کرنا نہیں بلکہ خود کو قابلِ استعمال بنانا اصل ہنر ہے۔

اسی حقیقت کو ایرک فروم نے نہایت واضح انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ «خود غرضی دراصل خود سے محبت نہیں بلکہ خود سے نفرت کی ایک شکل ہے۔» یہ جملہ انا کی نفسیات کو ننگا کر دیتا ہے۔ جو شخص خود کو ہر وقت مقدم رکھتا ہے، وہ دراصل اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ انقلابی تربیت اس حقیقت کو مان کر آگے بڑھتی ہے۔ وہ غرور کو اخلاقی خرابی نہیں بلکہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت سمجھتی ہے جسے پہچان کر توڑا جا سکتا ہے۔

غرور انسان کو ایک خطرناک فریب دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ تحریک اس کے بغیر نامکمل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں زوال شروع ہوتا ہے۔ انقلابی انسان اس فریب کو رد کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جدوجہد افراد سے بڑی ہوتی ہے، اور فرد کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ خود کو اس بڑے دائرے میں گم کر دے۔

وقت کی سیاست: پابندی، سستی اور تاریخی جواب دہی

وقت کو عموماً ایک تکنیکی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، جیسے یہ محض گھڑی، شیڈول یا نظم کا سوال ہو۔ حقیقت میں وقت ایک گہرا نفسیاتی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ انسان وقت کو جیسے برتتا ہے، وہی اس کی وابستگی، سنجیدگی اور شعور کی سطح کو ظاہر کرتا ہے۔ انقلابی جدوجہد میں وقت کی پابندی محض نظم نہیں بلکہ اخلاقی اور فکری اعلان ہوتی ہے۔

نفسیاتی طور پر سستی وقت کی کمی سے نہیں، معنی کی کمی سے جنم لیتی ہے۔ جب انسان کسی کام کو اپنے وجود سے جڑا ہوا محسوس نہیں کرتا تو وہ لاشعوری طور پر اسے مؤخر کرتا ہے۔ وہ وقت کو پھیلا دیتا ہے، ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے، اور خود کو یہ فریب دیتا ہے کہ ابھی موقع ہے۔ یہی فریب آہستہ آہستہ عادت بن جاتا ہے، اور عادت کردار۔

انقلابی انسان وقت کو غیر جانبدار شے نہیں سمجھتا۔ وہ جانتا ہے کہ ہر لمحہ یا تو جدوجہد کے حق میں جاتا ہے یا اس کے خلاف۔ درمیان میں کوئی خلا نہیں ہوتا۔ تاخیر بظاہر خاموش عمل ہے، مگر اس کا اثر بلند آواز فیصلوں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، کیونکہ یہ نظم، اعتماد اور اجتماعی رفتار کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔

یہاں وقت کی سیاست سامنے آتی ہے۔ جو شخص اپنے وقت کا جوابدہ نہیں، وہ کسی اور کے وقت کا بھی امین نہیں ہو سکتا۔ انقلابی تربیت میں وقت کی پابندی دراصل خود کو تاریخ کے سامنے جوابدہ سمجھنے کی ابتدائی شکل ہے۔ انسان یہ مان لیتا ہے کہ اس کی سستی صرف ذاتی مسئلہ نہیں بلکہ اجتماعی نقصان ہے۔

مسئلہ وقت کی قلت کا نہیں، استعمال کا ہے۔ انقلابی انسان اس حقیقت کو قبول کرتا ہے کہ ہر ضائع شدہ لمحہ اس کی ذمہ داری کا قرض بن جاتا ہے۔ وہ وقت کو بچانے کیلئے نہیں، برتنے کیلئے جیتا ہے۔ وقت کی پابندی سختی نہیں، شعور کی علامت ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان خود کو محض موجود نہیں بلکہ مؤثر سمجھتا ہے۔ انقلابی انسان جانتا ہے کہ تاریخ شور نہیں گنتی، لمحے گنتی ہے، اور وہ لمحے انہی کو ملتے ہیں جو وقت کو سنجیدگی سے لیتے ہیں۔

مزاح، طنز اور غیر سنجیدگی کی نفسیاتی حدیں

مزاح انسان کی فطری ضرورت ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ تناؤ کم کرتا ہے، ربط پیدا کرتا ہے اور مشکل حالات میں سانس لینے کی گنجائش دیتا ہے۔ مگر انقلابی جدوجہد میں مزاح ایک باریک لکیر پر چلتا ہے۔ یہی مزاح اگر حد سے بڑھ جائے تو سنجیدگی کو کھا جاتا ہے، اور یہی ہنسی اگر طنز میں بدل جائے تو باہمی اعتماد کو خاموشی سے توڑ دیتی ہے۔

مسلسل مزاح اکثر گہرے عدم تحفظ کی علامت ہوتا ہے۔ انسان جب کسی مقصد، ذمہ داری یا داخلی کشمکش کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے تو وہ غیر سنجیدگی کو ڈھال بنا لیتا ہے۔ ہنسی اس لمحے دفاع بن جاتی ہے۔ طنز اس وقت ہتھیار بنتا ہے جب انسان خود کو کمزور محسوس کرتا ہے مگر اس کمزوری کو تسلیم کرنے کے بجائے دوسروں کو نیچا دکھا کر توازن قائم کرنا چاہتا ہے۔

انقلابی انسان اس نفسیاتی فرق کو سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہنسی انسان کو قریب

لاسکتی ہے، مگر طنز انسان کو الگ کر دیتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر جگہ، ہر وقت اور ہر موضوع پر مزاح اختیار کرنا دراصل ذمہ داری سے فرار کی ایک صورت بن جاتا ہے۔ ایسی فضا میں تنظیم آہستہ آہستہ مقصد سے ہٹ کر ایک غیر سنجیدہ اجتماع میں بدلنے لگتی ہے، جہاں باتیں زیادہ اور عمل کم ہوتا ہے۔

انسان خود سے یہ سوال نہیں کرتا کہ وہ ہنس کیوں رہا ہے۔ اگر ہنسی مشکل کو سہنے کیلئے ہے تو وہ طاقت ہے۔ اگر ہنسی مشکل سے بچنے کیلئے ہے تو وہ کمزوری ہے۔ یہی فرق انقلابی مزاح اور غیر انقلابی غیر سنجیدگی کے درمیان لکیر کھینچتا ہے۔

اسی حقیقت کو وکٹر فرینکل نے اپنی زندگی کے تجربے سے یوں بیان کیا تھا۔ « مزاح روح کے اُن ہتھیاروں میں سے ایک ہے، جس کے ذریعے انسان لمحاتی طور پر خود کو حالات سے اوپر اٹھالیتا ہے۔ »

مزاح وہی کارآمد ہے جو انسان کو حالات سے اوپر اٹھائے، نہ کہ ذمہ داری سے نیچے گرادے۔ انقلابی انسان اسی لیئے مزاح کو ضبط میں رکھتا ہے۔ وہ ہنستا ہے، مگر مقصد پر نہیں۔ وہ خوش طبع ہوتا ہے، مگر جدوجہد کی قیمت پر نہیں۔ غیر سنجیدگی جب عادت بن جائے تو شعور کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ انقلابی تربیت کا مقصد مزاح کو ختم کرنا نہیں بلکہ اسے اس کی درست نفسیاتی اور اخلاقی حد میں رکھنا ہے، تاکہ ہنسی انسان کو مضبوط کرے، نہ کہ منتشر۔

ذاتی زندگی اور تحریکی زندگی کا ناگزیر تصادم

ذاتی زندگی اور تحریکی زندگی کے درمیان تصادم کوئی حادثہ نہیں بلکہ ایک فطری حقیقت ہے۔ جو بھی انسان کسی اجتماعی جدوجہد سے سنجیدگی کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، وہ جلد یا بدیر اس کشمکش کا سامنا کرتا ہے کہ اس کی خواہشات، آرام، تعلقات اور وقت کہاں ختم ہوتے ہیں، اور ذمہ داری کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس تصادم سے انکار خود فریبی ہے، اور اسے رومانوی بنا دینا بھی خطرناک ہے۔

انقلابی انسان اس حقیقت کو مان لیتا ہے کہ ہر انتخاب ایک ترک بھی ہوتا ہے۔ جب وہ تحریکی ذمہ داری کو ترجیح دیتا ہے تو وہ جان بوجھ کر کچھ ذاتی سہولتوں، کچھ خواہشات اور کچھ تعلقات کو محدود کرتا ہے۔ وہ اس محدودیت کو ظلم نہیں سمجھتا بلکہ ایک واضح فیصلہ مانتا ہے۔ اسی وضاحت کی کمی انسان کو اندر سے تھکا دیتی ہے، کیونکہ وہ بیک وقت دو متضاد مطالبات پورے کرنے کی

کوشش کرتا رہتا ہے۔

انسان یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کی زندگی کسی اور کی نہیں بلکہ اسی کے فیصلوں کا مجموعہ ہے۔ اگر وہ اپنی ترجیحات کو واضح نہ کرے تو حالات اس کی جگہ فیصلہ کرنے لگتے ہیں۔ اور حالات کے فیصلے ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں۔

اسی سچائی کو ژاں پال سارتر نے اس جملے میں بیان کیا تھا کہ « انسان وہی ہے جو وہ خود کو اپنے اعمال کے ذریعے بناتا ہے۔ » انقلابی انسان جانتا ہے کہ اگر وہ ذاتی زندگی کو ہر وقت اول رکھے گا تو تحریکی وابستگی محض دعویٰ بن کر رہ جائے گی۔ اور اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کیئے بغیر قربانی دے گا تو اندرونی تلخی اور شکوہ جنم لے گا۔

تحریکی زندگی کا تقاضہ یہ نہیں کہ انسان ذاتی زندگی سے نفرت کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی ترجیحات کو ایمانداری سے پہچانے۔ واضح انتخاب تھکاتا نہیں، ابہام تھکاتا ہے۔ انقلابی تربیت انسان کو اسی وضاحت تک لے جانے کی کوشش کرتی ہے، تاکہ وہ جو بھی کرے، پورے شعور کے ساتھ کرے۔

خاموشی، سننے اور نہ جاننے کی طاقت

خاموشی کو اکثر کمزوری سمجھا جاتا ہے، اور بولنے کو طاقت۔ یہ فہم نفسیاتی طور پر ناپختہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر انسان اس لیئے بولتا ہے کہ وہ سننے سے گھبراتا ہے۔ سننا انسان کو اپنی حدود، اپنی کم علمی اور اپنی غلطیوں کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ یہی سامنا اکثر انا کو ناگوار گزرتا ہے، اس لیئے خاموشی سے فرار اختیار کیا جاتا ہے۔

نفسیاتی طور پر ہر انسان کے اندر ایک دفاعی خواہش ہوتی ہے کہ وہ خود کو باخبر، بااختیار اور درست ثابت کرے۔ اسی خواہش کے تحت وہ ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے، ہر بحث میں رائے دیتا ہے، اور ہر معاملے میں خود کو مرکز بناتا ہے۔ مگر یہ مسلسل اظہار دراصل ذہنی شور پیدا کرتا ہے، جس میں فہم، تدبر اور سیکھنے کی صلاحیت دب جاتی ہے۔

انقلابی انسان اس شور سے نکلنا سیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خاموشی کا مطلب

لاعلمی نہیں، بلکہ اپنی لاعلمی کو پہچاننے کی جرات ہے۔ وہ ہر بات پر بولنے کے بجائے پہلے سنتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سننا انسان کو حقیقت کے قریب اور انا سے دور لے جاتا ہے۔ سننے کا عمل انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ ہر مسئلہ اس کے دائرہ کار میں نہیں، اور یہی شعور اسے بے جا مداخلت سے بچاتا ہے۔

انسان جب نہ جاننے کو تسلیم کرتا ہے تو وہ پہلی بار خود کو فریب سے آزاد کرتا ہے۔ وہ اپنی شناخت کو معلومات کے انبار سے نہیں بلکہ سچائی کی جستجو سے جوڑتا ہے۔ یہ جستجو انسان کو بدلتا ہے، کیونکہ وہ سوال کو سننے لگتا ہے، جواب گھڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔

خاموشی تب طاقت بنتی ہے جب وہ سیکھنے، سمجھنے اور خود کو محدود رکھنے کی شعوری صلاحیت ہو۔ انقلابی انسان خاموش اس لیئے نہیں رہتا کہ وہ کمزور ہے، بلکہ اس لیئے کہ وہ جانتا ہے کہاں بولنا ضروری ہے اور کہاں نہیں۔ خاموشی، سننا اور نہ جاننے کو قبول کرنا انقلابی تربیت میں کمزوری نہیں بلکہ پختگی کی علامت ہے۔ یہی پختگی انسان کو جلد بازی، غلط فیصلوں اور غیر ضروری ٹکراؤ سے بچاتی ہے، اور یہی صلاحیت اسے حقیقی معنوں میں مؤثر بناتی ہے۔

فیصلہ سازی اور ناکامی کے خوف کی تحلیل

انقلابی جدوجہد میں سب سے زیادہ مفلوج کرنے والی کیفیت دشمن کا خوف نہیں بلکہ ناکامی کا خوف ہوتا ہے۔ یہ خوف خاموش ہوتا ہے، مگر مسلسل رہتا ہے۔ یہ انسان کو قدم اٹھانے سے نہیں روکتا بلکہ قدم اٹھانے کو مؤخر کرتا رہتا ہے۔ اور یہی مؤخر شدہ فیصلہ آہستہ آہستہ ایک مستقل عادت بن جاتا ہے۔

نفسیاتی طور پر ناکامی کا خوف دراصل نقصان کے خوف سے کم اور شناخت کے خوف سے زیادہ جڑا ہوتا ہے۔ انسان ناکام ہونے سے اس لیئے نہیں گھبراتا کہ کام بگڑ جائے گا، بلکہ اس لیئے کہ اس کی اپنی شبیہ متاثر ہوگی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا کہ وہ غلط ثابت ہو، کمزور نظر آئے، یا اس کی رائے رد ہو جائے۔ اس خوف میں انسان فیصلہ کرنے کے بجائے تجزیہ پر تجزیہ کرتا رہتا ہے، اور خود کو یہ فریب دیتا ہے کہ وہ احتیاط برت رہا ہے۔

انقلابی انسان اس فریب کو پہچانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فیصلہ نہ کرنا بھی ایک

فیصلہ ہے، اور اکثر سب سے نقصان دہ۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ناکامی کوئی حادثہ نہیں بلکہ عمل کا لازمی امکان ہے۔ جو انسان ناکامی کے امکان کو قبول نہیں کرتا، وہ دراصل عمل کے حق سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ سارتر کہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی کے بوجھ سے گھبراتا ہے، کیونکہ آزادی کا مطلب انتخاب ہے، اور انتخاب کا مطلب ذمہ داری۔ اسی لیئے وہ فیصلہ ٹالتا ہے، تاکہ ذمہ داری بھی ٹل جائے۔ مگر وقت کسی کو مہلت نہیں دیتا۔ جو فیصلہ انسان نہیں کرتا، وہ حالات اس کی طرف سے کر دیتے ہیں۔

اسی حقیقت کو ہنّا آرینڈٹ نے یوں بیان کیا تھا کہ « عمل نہ کرنے کا انتخاب بھی عمل ہی کی ایک صورت ہے، اور اس کے نتائج سے کوئی بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ » ناکامی انسان کو نہیں توڑتا۔ خود سے فرار توڑتا ہے۔ جو انسان فیصلہ کرتا ہے، وہ سیکھتا ہے۔ جو سیکھتا ہے، وہ بدلتا ہے۔ اور جو بدلتا ہے، وہی جدوجہد کے قابل رہتا ہے۔ انقلابی انسان کامیابی کا متلاشی نہیں بلکہ ذمہ داری کا حامل ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تاریخ فیصلہ درست ہونے پر نہیں، فیصلہ لینے کی جرات پر لکھتی ہے۔

کمفرٹ زون، خوف اور انسان نما جانور سے انقلابی انسان تک

کمفرٹ زون کوئی جگہ نہیں، ایک نفسیاتی حالت ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں انسان جسمانی طور پر متحرک مگر ذہنی طور پر منجمد ہو جاتا ہے۔ وہ روز وہی کام دہراتا ہے، وہی سوچتا ہے، وہی جواز پیش کرتا ہے، اور اسی تکرار کو تحفظ کا نام دیتا ہے۔ نفسیاتی طور پر کمفرٹ زون خوف کی سب سے مہذب شکل ہے۔ یہ انسان کو یہ احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ ڈر رہا ہے، مگر اسی خوف کے سہارے اسے حرکت سے روکے رکھتا ہے۔

انقلابی جدوجہد میں کمفرٹ زون سب سے خطرناک دشمن ہوتا ہے، کیونکہ یہ کھلے تصادم کے بجائے عادت کی شکل میں کام کرتا ہے۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ چونکہ وہ موجود ہے، اس لیئے وہ مؤثر بھی ہے۔ چونکہ وہ سرگرمیوں کے قریب ہے، اس لیئے وہ جدوجہد کا حصہ بھی ہے۔ یہی فریب انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ جانور کی طرح زندہ رہتا ہے، مگر انسان کی طرح انتخاب

نہیں کرتا۔

نفسیاتی طور پر کمفرٹ زون انسان کو رسک سے ڈراتا ہے، اور رسک کو غیر ضروری کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ وہ ہر نئے قدم کو خطرہ، ہر نئی ذمہ داری کو بوجھ، اور ہر تبدیلی کو انتشار قرار دیتا ہے۔ یوں انسان اپنی حفاظت کے نام پر اپنی ہی صلاحیتوں کو قید کر لیتا ہے۔ یہ قید خاموش ہوتی ہے، مگر مکمل۔

انسان یا تو خوف کے ساتھ جینا سیکھتا ہے، یا خوف کے سہارے جینا۔ انقلابی انسان پہلے راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خوف ختم نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود عمل کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ بغیر خطرہ مول لیئے کوئی بھی تبدیلی ممکن نہیں، چاہے وہ ذاتی ہو یا اجتماعی۔

طاقت حفاظت سے نہیں، تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ انقلابی انسان خطرے کو پسند نہیں کرتا، مگر اس سے بھاگتا بھی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ جو انسان صرف محفوظ رہنے کا عادی ہو جائے، وہ آہستہ آہستہ انسان نہیں رہتا بلکہ ایک محتاط، مگر بے اختیار وجود میں بدل جاتا ہے۔ کمفرٹ زون توڑنا خود کو اذیت دینا نہیں، بلکہ خود کو اختیار واپس دینا ہے۔ یہی اختیار انسان کو جانور سے الگ کرتا ہے، اور یہی اختیار انقلابی انسان کی پہلی پہچان بنتا ہے۔

خود تنقیدی بطور بقا کا ہتھیار

خود تنقیدی کو اکثر کمزوری، انتشار یا عدم اعتماد کی علامت سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ فہم نفسیاتی طور پر غلط ہے۔ حقیقت میں خود تنقیدی انسان کی ذہنی صحت اور فکری بقا کا بنیادی ہتھیار ہے۔ جو فرد یا تحریک خود پر سوال اٹھانے کی صلاحیت کھو دیتا ہے، وہ آہستہ آہستہ جمود کا شکار ہو جاتا ہے، اور جمود بالآخر زوال میں بدل جاتا ہے۔

نفسیاتی سطح پر خود تنقیدی انا کیلیئے سب سے مشکل عمل ہوتا ہے۔ انا فطری طور پر اپنے دفاع میں رہتی ہے۔ وہ غلطی کو ماننے کے بجائے جواز پیدا کرتی ہے، تنقید کو دشمنی سمجھتی ہے، اور اصلاح کو تضحیک کا نام دیتی ہے۔ یہ وہ نہج ہے جہاں انسان سیکھنا بند کر دیتا ہے۔ اور جو سیکھنا بند کر دے، وہ دراصل بدلنا بھی بند کر دیتا ہے۔

انقلابی انسان اس نفسیاتی جال کو پہچانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خود تنقیدی کا

مطلب خود کو گرانا نہیں بلکہ خود کو درست جگہ پر رکھنا ہے۔ وہ اپنی غلطیوں کو اخلاقی ناکامی نہیں بلکہ سیکھنے کا مواد سمجھتا ہے۔ یہی رویہ اسے دوسروں کی تنقید سننے کے قابل بناتا ہے، کیونکہ جس نے خود کو پرکھنا سیکھ لیا ہو، وہ بیرونی سوال سے نہیں گھبراتا۔

خود تنقیدی انسان کو اس کے انتخاب کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ انسان یہ مان لیتا ہے کہ اس کے فیصلے اس کے اپنے تھے، اور ان کے نتائج کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ یہ قبولیت تکلیف دہ ہو سکتی ہے، مگر یہی تکلیف شعور کو گہرا کرتی ہے۔ خود تنقیدی دراصل اس وہم کا خاتمہ ہے کہ انسان ہمیشہ درست ہو سکتا ہے۔

اسی نکتے کو کارل پوپر نے یوں بیان کیا تھا کہ «تنقید علم کی زندگی ہے، اور تنقید کے بغیر کوئی فہم آگے نہیں بڑھتا۔» یہ جملہ صرف علم کیلئے نہیں، جدوجہد کیلئے بھی اتنا ہی درست ہے۔ جو تحریک خود تنقیدی سے خوفزدہ ہو، وہ اپنی غلطیوں کو مقدس بنا لیتی ہے۔ اور مقدس غلطیاں سب سے خطرناک ہوتی ہیں، کیونکہ ان پر سوال اٹھانا ممنوع ہو جاتا ہے۔

انقلابی تربیت میں خود تنقیدی کا مقصد الزام تراشی نہیں بلکہ بقا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو فرد اور تنظیم دونوں کو جمود سے بچاتا ہے۔ جو خود پر سوال اٹھا سکتا ہے، وہ دشمن کے سوال سے نہیں ٹوٹتا۔ اور جو اپنی خامیوں کو دیکھ سکتا ہے، وہی انہیں بدلنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔

شکایت، الزام تراشی اور فکری ناپختگی

شکایت اورالزام تراشی بظاہر کمزوری کا اظہار لگتی ہیں، مگر نفسیاتی طور پر یہ ایک دفاعی حکمتِ عملی ہوتی ہے۔ انسان جب اپنی ناکامی، الجھن یا نااہلی کا سامنا کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر ذمہ داری کو اپنے وجود سے باہر منتقل کر دیتا ہے۔ یہی منتقلی شکایت کی زبان اختیار کر لیتی ہے، اور الزام تراشی اس زبان کا سب سے آسان لہجہ بن جاتی ہے۔

نفسیاتی سطح پر شکایت دراصل خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ انسان یہ ماننے کے بجائے کہ اس نے کہیں کوتاہی کی، حالات، افراد یا نظام کو موردِ الزام ٹھہرا دیتا ہے۔ اس عمل سے وقتی سکون تو ملتا ہے، مگر اس کی قیمت بہت بھاری ہوتی ہے۔ انسان سیکھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے، کیونکہ جو خود کو ہر حال میں درست سمجھے، وہ بدلنے کی ضرورت کیوں محسوس کرے گا۔

انقلابی انسان اس نفسیاتی فریب کو پہچانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شکایت شعور کو

پھیلاتی نہیں، سمیٹ دیتی ہے۔ الزام تراشی انسان کو وقتی طور پر ہلکا کر دیتی ہے، مگر اندر سے کمزور۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ہر مسئلے میں دوسرے کی غلطی ڈھونڈنا دراصل اپنی ذمہ داری سے دستبرداری ہے۔ جو انسان ہر ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرا دے، وہ آہستہ آہستہ خود کو غیر مؤثر ماننے لگتا ہے۔

انسان یا تو اپنی زندگی کو اپنے فیصلوں کا نتیجہ مانتا ہے، یا پھر اسے دوسروں کی سازش، ناانصافی اور بدنیتی کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ پہلا راستہ تکلیف دہ ہے، مگر آزادی کی طرف جاتا ہے۔ دوسرا راستہ آسان ہے، مگر دائمی جمود کی طرف۔

اسی نفسیاتی حقیقت کو کارل یونگ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے «جو چیز ہمیں دوسروں میں سب سے زیادہ کھٹکتی ہے، وہ اکثر ہمیں خود اپنے بارے میں کچھ سمجھا رہی ہوتی ہے۔» انسان جن خامیوں پر سب سے زیادہ شور مچاتا ہے، وہی خامیاں اکثر اس کے اپنے اندر غیر شعوری طور پر موجود ہوتی ہیں۔ انقلابی تربیت کا مقصد اسی شور کو خاموش کر کے انسان کو اس کے اندر کی طرف موڑنا ہے۔

شکایت سے تحریک نہیں چلتی۔ الزام سے نظم نہیں بنتا۔ انقلابی انسان اس لیئے شکایت کم اور سوال زیادہ کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتا کہ قصور کس کا ہے، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ ذمہ داری کہاں اس کے ہاتھ میں آتی ہے۔ یہی رویہ فکری پختگی کی علامت ہے، اور یہی پختگی جدوجہد کو آگے بڑھاتی ہے۔

کرپشن اور خود غرضی کی غیر مالی شکلیں

کرپشن کو عموماً پیسے، خرد برد یا وسائل کی چوری تک محدود سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ فہم سطحی ہے۔ نفسیاتی طور پر کرپشن ایک رویہ ہے، اور رویہ صرف مالی نہیں ہوتا۔ جب انسان اپنی سہولت، انا یا ذاتی ترجیح کو اجتماعی ذمہ داری پر فوقیت دیتا ہے تو وہ اسی لمحے کرپشن کی ایک غیر مالی شکل میں داخل ہو جاتا ہے، چاہے اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ بھی نہ ہو۔

نفسیاتی سطح پر خود غرضی اکثر شعوری بدنیتی نہیں ہوتی بلکہ غیر شعوری ترجیح ہوتی ہے۔ انسان اپنے آرام، اپنے وقت، اپنی شہرت یا اپنی رائے کو اس حد تک اہم سمجھنے لگتا ہے کہ مقصد پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ وہ کام تو کرتا ہے، مگر اپنی شرائط پر۔ وہ ذمہ داری تو قبول کرتا ہے، مگر اپنی سہولت کے مطابق۔ اس طرح کرپشن خاموشی سے معمول بن جاتی ہے۔

غیر مالی کرپشن کی صورتیں باریک ہوتی ہیں۔ کام میں ٹال مٹول، ذمہ داری کو

جزوی طور پر نبھانا، تنظیمی وسائل کو ذاتی عادت کے مطابق استعمال کرنا، یا اپنی نااہلی کو حالات کے کھاتے میں ڈال دینا، یہ سب کرپشن کی وہ شکلیں ہیں جو اکثر نظر نہیں آتیں مگر اندر سے نظم کو کھا جاتی ہیں۔ یہاں نقصان فوری نہیں ہوتا، مگر مستقل ہوتا ہے۔

انقلابی انسان اس باریکی کو سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کرپشن ہمیشہ لالچ سے نہیں، اکثر بے حسی سے جنم لیتی ہے۔ جب انسان اپنے عمل کے اثرات کے بارے میں حساس نہ رہے تو وہ آہستہ آہستہ خیانت کو معمول سمجھنے لگتا ہے۔ یہی معمول سب سے خطرناک ہوتا ہے، کیونکہ اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھتی۔

انسان یا تو اپنے ہر عمل کو اجتماعی نتائج کے ساتھ جوڑتا ہے، یا پھر اسے ذاتی معاملہ قرار دے کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیتا ہے۔ پہلا راستہ مشکل ہے، مگر ذمہ داری کی طرف جاتا ہے۔ دوسرا راستہ آسان ہے، مگر اخلاقی انحطاط کی طرف جاتا ہے۔

اسی نکتے کو میکس ویبر نے ذمہ داری کی اخلاقیات پر بات کرتے ہوئے نہایت واضح انداز میں بیان کیا تھا۔ » انسان اپنے اعمال کے متوقع نتائج کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے، صرف اپنی نیت کا نہیں۔ » میکس ویبر کا یہ جملہ غیر مالی کرپشن کی بنیاد کو ہلا دیتا ہے۔ نیت صاف ہونے کا دعویٰ اس وقت بے معنی ہو جاتا ہے جب عمل کے نتائج نقصان دہ ہوں۔ انقلابی تربیت اسی لیئے نیت سے زیادہ اثر

کو دیکھتی ہے، اور سہولت سے زیادہ ذمہ داری کو۔

کرپشن کا خاتمہ قانون سے نہیں، شعور سے ہوتا ہے۔ اور شعور اس لمحے جنم لیتا ہے جب انسان اپنی ہر ترجیح کو مقصد کے سامنے رکھ کر پرکھنا سیکھ لے۔

مہارت، محنت اور نظم کا باھمی تعلق

محنت کو اکثر نیکی، اور مہارت کو قدرتی صلاحیت سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ دونوں فہم نفسیاتی طور پر ادھورے ہیں۔ محنت اگر نظم کے بغیر ہو تو وہ تھکن میں بدل جاتی ہے، اور مہارت اگر محنت کے بغیر ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے۔ انقلابی انسان ان دونوں کے درمیان تعلق کو سمجھتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ صرف نیک نیتی کسی جدوجہد کو مؤثر نہیں بناتی۔

انسان محنت کو اس لیئے رومانوی بناتا ہے کہ اس میں فوری اخلاقی تسکین ملتی ہے۔ محنت کرتے ہوئے انسان خود کو درست محسوس کرتا ہے، چاہے نتیجہ کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ مگر مہارت ایک بے رحم آئینہ ہے۔ یہ انسان کو اس کی حدود دکھاتی ہے، اس کی غلطیاں سامنے رکھتی ہے، اور اس سے مسلسل سیکھنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسی لیئے بہت سے لوگ محنت کو ترجیح دیتے ہیں، مگر مہارت سے کتراتے ہیں۔

انقلابی نظم اس فرق کو واضح کرتا ہے۔ نظم محنت کو سمت دیتا ہے، اور مہارت کو قابلِ استعمال بناتا ہے۔ بغیر نظم کے محنت بے ترتیب توانائی ہے، اور بغیر مہارت کے نظم محض اطاعت۔ انقلابی انسان ان دونوں کو جوڑتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اجتماعی جدوجہد میں ہر غلطی کی قیمت صرف فرد نہیں بلکہ پورا ڈھانچہ ادا کرتا ہے۔

اسی حقیقت کو ارسطو یوں بیان کیا تھا۔ « کمال کوئی واحد عمل نہیں، بلکہ ایک عادت ہے۔ » کمال وقتی جوش سے نہیں، مسلسل درست عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ انقلابی انسان اسی لیئے وقتی سرگرمی کے بجائے مستقل معیار کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ کم یا زیادہ کام کرتا ہے، مگر درست طریقے سے کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ معیار ہی اعتماد پیدا کرتا ہے۔

محنت اگر مہارت سے جڑی ہو، اور مہارت نظم کے تابع ہو، تو جدوجہد خام توانائی نہیں رہتی بلکہ مؤثر قوت بن جاتی ہے۔ یہی قوت انقلابی انسان کی اصل پہچان ہے، اور یہی پہچان تحریک کو دیرپا بناتی ہے۔

شعوری وابستگی بمقابلہ جذباتی وابستگی

جذباتی وابستگی تیز ہوتی ہے، مگر ناپائیدار۔ شعوری وابستگی آہستہ بنتی ہے، مگر دیرپا۔ انقلابی جدوجہد میں اکثر لوگ جذبات کے زور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ غصہ، دکھ، رومان اور مظلومیت انہیں متحرک کرتے ہیں، مگر یہی جذبات اگر شعور میں نہ ڈھلیں تو جلد تھکن، مایوسی اور شکوے میں بدل جاتے ہیں۔ مسئلہ جذبات کا نہیں، ان کی مرکزیت کا ہے۔

جذباتی وابستگی انسان کو فوری معنی کا احساس دیتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ کسی بڑے مقصد کا حصہ بن گیا ہے، مگر اس وابستگی میں ایک خطرہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ انسان مقصد کے بجائے اپنے احساس کو بچانے لگتا ہے۔ جب حالات اس احساس کے مطابق نہ ہوں تو وہ خود کو دھوکے میں محسوس کرتا ہے۔ اس لیئے جب حالات سخت ہو جائیں تو جذباتی وابستگی ٹوٹتی ہے، اور انسان خود کو تنہا سمجھنے لگتا ہے۔

شعوری وابستگی اس کے برعکس عمل کرتی ہے۔ یہاں انسان پہلے سمجھتا ہے، پھر جڑتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جدوجہد میں تضاد، ناکامی اور طویل خاموشی ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہر لمحہ جذباتی تسکین نہیں ملے گی۔ اسی علم کے ساتھ وہ وابستگی اختیار کرتا ہے، اس لیئے اس کی توقعات کم اور برداشت زیادہ ہوتی ہے۔

انسان یا تو اپنی وابستگی کو احساس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے، یا اسے شعوری فیصلے میں بدل دیتا ہے۔ پہلا راستہ انسان کو حالات کا قیدی بناتا ہے۔ دوسرا راستہ اسے ذمہ داری کا حامل بناتا ہے۔ شعوری وابستگی میں انسان یہ نہیں پوچھتا کہ مجھے کیا ملے گا، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ مجھ سے کیا درکار ہے۔

اسی فرق کو ہنّا آرینڈٹ نے ذمہ داری اور عمل کے تعلق پر بات کرتے ہوئے نہایت گہرے مفہوم میں واضح کیا تھا کہ «سیاسی عمل جذبات سے نہیں، ذمہ داری کے شعوری قبول سے جنم لیتا ہے۔»

جذبات آتے جاتے رہتے ہیں، مگر ذمہ داری ٹھہرتی ہے۔ انقلابی انسان اسی لیئے اپنے احساسات کا انکار نہیں کرتا، مگر انہیں رہنما بھی نہیں بناتا۔ وہ جذبات کو توانائی بناتا ہے، مگر سمت شعور سے لیتا ہے۔

شعوری وابستگی انسان کو ٹوٹنے سے نہیں روکتی، مگر بکھرنے سے ضرور بچاتی ہے۔ یہی وابستگی جدوجہد کو وقتی جوش سے نکال کر ایک طویل، صابر اور باوقار سفر میں بدل دیتی ہے۔

رائے، اختلاف اور تنظیمی دائرہ کار

اختلاف بذاتِ خود کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اختلاف کو انا کی توسیع، یا رائے کو خود نمائی کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ انسان اپنی رائے سے اس حد تک جُڑ جاتا ہے کہ اس پر تنقید کو اپنی ذات پر حملہ سمجھنے لگتا ہے۔ یہی الجھاؤ اختلاف کو فکری عمل کے بجائے جذباتی تصادم میں بدل دیتا ہے۔

انقلابی انسان اس فرق کو سمجھتا ہے کہ رائے رکھنا اور رائے کو نافذ کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہر فرد کا زاویہ نظر ہو سکتا ہے، مگر ہر زاویہ ہر مقام پر قابلِ اطلاق نہیں ہوتا۔ تنظیمی جدوجہد میں رائے کی قدر اس کی سچائی سے نہیں بلکہ اس کے محل، وقت اور اثر سے متعین ہوتی ہے۔ جو رائے تنظیمی دائرہ کار سے باہر پیش کی جائے، وہ اکثر اصلاح کے بجائے انتشار پیدا کرتی ہے۔

نفسیاتی سطح پر غیر متعلقہ جگہ رائے دینا اکثر توجہ کی طلب، عدم تسلیم شدگی یا

اندرونی بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر اس کی بات سنی نہ گئی تو اس کی حیثیت کم ہو جائے گی۔ اسی خوف میں وہ نظم کو توڑنے کو جرات اور اختلاف کو بہادری سمجھنے لگتا ہے۔ انقلابی شعور اس فریب کو پہچانتا ہے۔

ایک انقلابی انسان کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اجتماعی جدوجہد میں اس کی ذات مرکز نہیں ہوتی۔ رائے کا حق ذمہ داری کے ساتھ آتا ہے، اور ذمہ داری کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی بات وہاں کہے جہاں وہ مقصد کو مضبوط کرے، نہ کہ اپنی موجودگی کو نمایاں۔

اسی اصول کو ہنّا آرینڈٹ نے عمل اور گفتگو کے تعلق پر بات کرتے ہوئے یوں واضح کیا تھا۔ « گفتگو تب سیاسی معنی رکھتی ہے جب وہ ایک مشترکہ دنیا کو قائم رکھے، نہ کہ صرف بولنے والے کی ذات کو نمایاں کرے۔ » انقلابی انسان اپنی رائے کو اظہارِ ذات نہیں بلکہ اجتماعی فہم کی تعمیر کا ذریعہ بناتا ہے۔ تنظیمی دائرہ کار دراصل رائے کو دبانے کا نہیں، اسے موثر بنانے کا طریقہ ہے۔ جو ایک انقلابی انسان اس دائرے کو سمجھ لیتا ہے، وہ اختلاف کو تخریب کے بجائے تعمیر میں بدل دیتا ہے۔ یہی فرق فکری ناپختگی اور انقلابی پختگی کے درمیان حد کھینچتا ہے۔

مقصد، معنی اور بوریت کا فریب

بوریت کو اکثر فراغت، آرام یا حالات کی سستی سے جوڑ دیا جاتا ہے، مگر نفسیاتی طور پر بوریت ایک خطرناک علامت ہے۔ یہ اس وقت جنم لیتی ہے جب انسان کا عمل اس کے مقصد سے کٹ جائے۔ جہاں معنی ختم ہوتے ہیں، وہاں وقت بھاری ہو جاتا ہے، اور جہاں وقت بھاری ہو جائے، وہاں انسان خود کو غیر ضروری محسوس کرنے لگتا ہے۔

انقلابی جدوجہد میں بوریت کسی کام کی کمی کی وجہ سے نہیں آتی، بلکہ مقصد کی کمزوری کی وجہ سے آتی ہے۔ جو انسان واقعی کسی جدوجہد کو اپنے وجود سے جوڑ لیتا ہے، اس کے لیئے وقت کبھی خالی نہیں ہوتا۔ وہ تھک سکتا ہے، ٹوٹ سکتا ہے، مگر بور نہیں ہو سکتا۔ بوریت دراصل اس لمحے پیدا ہوتی ہے جب انسان اندر سے یہ سوال چھوڑ دیتا ہے کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔

نفسیاتی طور پر بوریت خود کو دھوکہ دینے کا ایک نرم طریقہ ہے۔ انسان یہ کہتا

ہے کہ ماحول غیر متحرک ہے، حالات جامد ہیں، یا کام میں دلچسپی نہیں رہی، مگر اصل میں وہ اپنے مقصد سے جذباتی اور فکری رابطہ کھو چکا ہوتا ہے۔ یہ رابطہ ٹوٹنے پر انسان سرگرمیوں کو مشغلہ سمجھنے لگتا ہے، اور جدوجہد کو وقت گزاری۔

انسان یا تو اپنے عمل کو معنی سے جوڑتا ہے، یا پھر معنی کے بغیر حرکت کرتا ہے۔ دوسری صورت میں حرکت بوجھ بن جاتی ہے، اور یہی بوجھ بوریت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ انقلابی انسان اس فریب کو پہچانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مسئلہ یہ نہیں کہ کرنے کو کچھ نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ کرنے کا سبب دھندلا گیا ہے۔

اسی حقیقت پر وکٹر فرینکل نے کہا تھا۔ » جب انسان اپنی زندگی کے معنی سے کٹ جاتا ہے، تو خلا فوراً بے چینی، تھکن اور بے مقصدیت سے بھر جاتا ہے۔ » یہ جملہ بوریت کو محض ذہنی کیفیت نہیں بلکہ معنوی بحران کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ انقلابی تربیت اسی لیئے مصروفیت نہیں، مقصد پیدا کرنے پر زور دیتی ہے۔ کام کی کثرت نہیں، معنی کی وضاحت اصل ضرورت ہے۔

انقلابی انسان بوریت کو شکایت نہیں بناتا بلکہ سوال بناتا ہے۔ وہ خود سے پوچھتا ہے کہ اس کا مقصد کہاں دھندلا ہوا، اور وہ اسے دوبارہ کیسے واضح کرے۔ یہی سوال جدوجہد کو تازہ کرتا ہے، اور یہی تازگی انسان کو وقت کے بوجھ سے آزاد رکھتی ہے۔

گمنامی، ضبط اور غیر نمائشی جدوجہد

گمنامی کو اکثر کم حیثیتی یا ناکامی سمجھا جاتا ہے، جبکہ نفسیاتی طور پر یہ ضبط کی سب سے مشکل شکل ہے۔ انسان فطری طور پر پہچان، توثیق اور اعتراف چاہتا ہے۔ جب یہ خواہش حد سے بڑھ جائے تو جدوجہد مقصد نہیں رہتی بلکہ نمائش بن جاتی ہے۔ انقلابی انسان اس نفسیاتی کمزوری کو پہچانتا ہے اور اسے نظم کے ذریعے قابو میں رکھتا ہے۔

نمائش کی خواہش اکثر عدمِ تحفظ سے جنم لیتی ہے۔ انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر اسے دیکھا نہ گیا تو اس کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ اسی خوف میں وہ اپنے عمل کو دکھاوے میں بدل دیتا ہے، اور اپنی خاموش محنت کو بیان کی شکل دے دیتا ہے۔ یہ رویہ وقتی تسکین دیتا ہے، مگر اندرونی استحکام کو کمزور کرتا ہے۔ ضبط اس کے برعکس عمل کرتا ہے۔ ضبط انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ ہر درست عمل کا اعلان ضروری نہیں، اور ہر خاموشی نقصان نہیں ہوتی۔

انقلابی جدوجہد میں گمنامی ایک نفسیاتی تربیت ہے۔ یہ انسان کو اپنی ذات سے پیچھے ہٹنے اور مقصد کے قریب آنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ جو انسان گمنامی برداشت کر لیتا ہے، وہ تنقید سے نہیں ٹوٹتا اور تعریف سے نہیں بہکتا۔ یہی توازن اسے مسلسل عمل کے قابل رکھتا ہے۔ غیر نمائشی جدوجہد میں انسان نتیجے پر توجہ دیتا ہے، تاثر پر نہیں۔

انسان یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کی قدر دوسروں کی نگاہ سے نہیں بلکہ اس کے اپنے معیار سے متعین ہوتی ہے۔ جب یہ معیار واضح ہو جائے تو شہرت کی طلب کمزور پڑ جاتی ہے۔ انقلابی انسان جانتا ہے کہ جو جدوجہد نمائش کی محتاج ہو، وہ اندر سے خالی ہوتی ہے۔

جب عمل اعتراف کا محتاج نہ رہے تو وہ زیادہ دیانت دار، زیادہ مستقل اور زیادہ مؤثر ہو جاتا ہے۔ انقلابی تربیت اسی لیئے ضبط کو خاموش قوت مانتی ہے، نہ کہ کمزوری۔ گمنامی خود کو مٹانا نہیں، خود کو درست جگہ پر رکھنا ہے۔ یہی جگہ انسان کو دکھاوے کے بوجھ سے آزاد کرتی ہے، اور یہی آزادی جدوجہد کو طویل اور مضبوط بناتی ہے۔

اخلاقی جرات اور سچائی کی قیمت

اخلاقی جرات کسی بلند نعرے یا جذباتی للکار کا نام نہیں۔ یہ ایک خاموش، مسلسل اور مہنگا عمل ہے۔ اخلاقی جرات اس لمحے جنم لیتی ہے، جب انسان یہ قبول کرلیتا ہے کہ سچائی ہمیشہ محفوظ نہیں ہوتی، اور اس کی قیمت اکثر تنہائی، مخالفت اور نقصان کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اسی خوف کی وجہ سے اکثر لوگ سچ جانتے ہوئے بھی خاموش رہتے ہیں، یا سچ کو نرم کرکے قابلِ قبول بنالیتے ہیں۔

انقلابی جدوجہد میں سب سے بڑا فریب یہ ہوتا ہے کہ سچ ہمیشہ فائدہ مند ہوگا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سچ اکثر تکلیف دیتا ہے، نظم کو ہلاتا ہے، اور طاقت کے توازن کو چیلنج کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر انسان اس ٹکراؤ سے بچنے کیلئے خود کو یہ کہہ کر مطمئن کرلیتا ہے کہ ابھی وقت مناسب نہیں، یا حالات اجازت نہیں دیتے۔ یہی تاخیر آہستہ آہستہ اخلاقی بزدلی میں بدل جاتی ہے۔

اخلاقی جرات کا مطلب ضد یا جارحیت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر سچائی کو ترجیح دے، چاہے اس کی قیمت اس کی مقبولیت، آرام یا وقتی تحفظ ہو۔ انقلابی انسان اس نکتے کو سمجھتا ہے کہ جو جدوجہد سچ کو قربان کر کے چلائی جائے، وہ وقتی طور پر مضبوط نظر آسکتی ہے، مگر اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے۔

انسان یا تو اپنی زندگی کو سہولت کے مطابق ڈھالتا ہے، یا سچ کے مطابق۔ دونوں ایک ساتھ ممکن نہیں۔ سچ کے ساتھ جینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر کو بیرونی منظوری پر قربان نہ کرے۔ جب سچ کو بار بار قربان کیا جائے تو صرف جھوٹ نہیں پھیلتا، بلکہ انسان کی حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ انقلابی تربیت اسی لیئے اخلاقی جرات کو فرد کی ذاتی خوبی نہیں بلکہ جدوجہد کی بقا کی شرط مانتی ہے۔

اخلاقی جرات انسان کو محفوظ نہیں بناتا، مگر اسے قابلِ احترام ضرور بناتی ہے۔ اور جدوجہد میں احترام طاقت سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ جو انسان سچ کی قیمت ادا کرنا سیکھ لے، وہی جدوجہد کو اپنے ضمیر کے ساتھ آگے لے جا سکتا ہے۔

تبدیلی بطور مسلسل عمل، منزل نہیں

تبدیلی کو اکثر ایک واضح منزل سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایک ایسا مقام جہاں پہنچ کر جدوجہد ختم ہو جائے گی، مسائل حل ہو جائیں گے، اور انسان سکون میں داخل ہو جائے گا۔ یہ تصور نفسیاتی طور پر پُرکشش ہے، مگر حقیقت سے کٹا ہوا۔ تبدیلی اگر منزل بن جائے تو وہ حرکت کھو دیتی ہے، اور جہاں حرکت رُک جائے وہاں زوال شروع ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی سطح پر انسان تبدیلی کو اس لیئے محدود کرنا چاہتا ہے تاکہ بے یقینی ختم ہو جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ ایک دن آئے جب اسے مزید سیکھنا، بدلنا یا خود کو پرکھنا نہ پڑے۔ مگر یہی خواہش انسان کو اندر سے ساکن کر دیتی ہے۔ جو شخص تبدیلی کو مکمل شدہ حقیقت سمجھ لے، وہ لاشعوری طور پر سوال کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور جو سوال چھوڑ دے، وہ شعور بھی کھو دیتا ہے۔

انقلابی انسان اس فریب کو قبول نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ تبدیلی ایک مسلسل عمل ہے، جو کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ ہر نیا مرحلہ

نئی ذمہ داریاں، نئے تضادات اور نئے سوالات لے کر آتا ہے۔ اسی لیئے وہ کامیابی کو اختتام نہیں بلکہ ایک نئے امتحان کا آغاز سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ناکامی نہیں، بلکہ ٹھہراؤ ہے۔

انسان یا تو خود کو ایک مکمل شناخت سمجھتا ہے، یا ایک جاری عمل۔ پہلی صورت میں وہ خود کو بچانے لگتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ خود کو بدلنے کیلیئے تیار رہتا ہے۔ انقلابی انسان دوسرے راستے کا انتخاب کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو خود کو مکمل سمجھ لے، وہ تاریخ کے ساتھ چلنا چھوڑ دیتا ہے۔

اسی حقیقت کو ہیر قلیطس نے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ «کوئی شخص ایک ہی دریا میں دو بار قدم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ نہ دریا وہی رہتا ہے اور نہ وہ شخص۔» ہیر قلیطس تبدیلی کو ایک حقیقت نہیں بلکہ ایک حالت کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ ہر لمحہ بدل رہا ہے، چاہے انسان اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔ انقلابی تربیت کا مقصد اس تبدیلی کو روکنا نہیں بلکہ اسے شعوری بنانا ہے۔ انسان بدلتا رہے، مگر اندھا نہیں۔ حرکت کرے، مگر بے سمت نہیں۔

تبدیلی منزل نہیں، ذمہ داری ہے۔ جو انسان اس ذمہ داری کو قبول کر لے، وہ کبھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ پہنچ چکا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ اسے چلتے رہنا ہے، خود کو پرکھتے رہنا ہے، اور ہر نئے دن میں اپنی جدوجہد کو دوبارہ معنی دینا ہے۔ یہی مسلسل عمل انقلابی انسان کی آخری اور سب سے پختہ شناخت ہے۔

مظلومیت بطور سیاسی بیانیہ، اور اس کی نفسیاتی قیمت

مظلومیت ایک تاریخی حقیقت ہو سکتی ہے، مگر جب یہ اجتماعی بیانیہ بن جائے تو نفسیاتی طور پر خطرناک ہو جاتی ہے۔ یہاں مسئلہ ظلم کے انکار کا نہیں، بلکہ اس بات کا ہے کہ ظلم کو ہم اپنی سیاست میں کیسے استعمال کرتے ہیں۔ جب مظلومیت مستقل شناخت بن جائے تو وہ جدوجہد کو اخلاقی برتری کے خول میں بند کر دیتی ہے، جہاں سوال، تنقید اور احتساب کو غیر ضروری یا غداری سمجھا جانے لگتا ہے۔

اجتماعی نفسیات میں مظلومیت کا بیانیہ ایک خاص سہولت فراہم کرتا ہے۔ یہ ہر ناکامی کی وضاحت مہیا کر دیتا ہے، ہر کمزوری کو بیرونی سازش سے جوڑ دیتا ہے، اور ہر داخلی سوال کو وقت سے پہلے خاموش کر دیتا ہے۔ اس فضا میں تنظیمی غلطیاں اصلاح کا موضوع نہیں رہتیں بلکہ دفاع کا معاملہ بن جاتی ہیں۔

نتیجتاً تحریک خود کو درست ثابت کرنے میں مصروف رہتی ہے، بہتر بنانے میں نہیں۔

یہ بیانیہ کارکن کی نفسیات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ خود کو ایک فعال فاعل کے بجائے ایک مستقل متاثرہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کیفیت میں ذمہ داری بوجھ بن جاتی ہے، نظم جبر محسوس ہونے لگتا ہے، اور مہارت ثانوی ہو جاتی ہے۔ مظلومیت یہاں ہمدردی تو پیدا کرتی ہے، مگر طاقت پیدا نہیں کرتی۔

انقلابی شعور اس مقام پر ایک مشکل مگر ضروری فرق قائم کرتا ہے۔ وہ مانتا ہے کہ ظلم حقیقت ہے، مگر یہ بھی مانتا ہے کہ ظلم ہر سوال کا جواب نہیں بن سکتا۔ جدوجہد وہاں کمزور ہوتی ہے جہاں مظلومیت کو دلیل، جواز اور ڈھال تینوں بنا لیا جائے۔ یہاں مظلومیت طاقت کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ طاقت کے فریب میں بدل جاتی ہے۔

اسی نکتے کو فینن نے نہایت غیر رومانوی انداز میں واضح کیا تھا۔ «نو آبادیاتی صورتِ حال خود بخود آزادی پیدا نہیں کرتی، آزادی انسان کو خود تعمیر کرنی پڑتی ہے۔» فینن مظلومیت کے بیانیئے کو اس کی حد میں رکھتا ہے۔ ظلم وجود میں آسکتا ہے، مگر آزادی کی صلاحیت خود بخود پیدا نہیں ہوتی۔ اسے نظم، شعور، مہارت اور خود احتسابی کے ذریعے پیدا کرنا پڑتا ہے۔

انقلابی تحریک اس وقت بالغ ہوتی ہے جب وہ مظلوم ہوتے ہوئے بھی مظلومیت کی سیاست سے باہر نکلنا سیکھ لے۔ جہاں ظلم پس منظر میں رہے، مگر فیصلہ سازی، خود تنقیدی اور تنظیمی معیار مرکز میں آ جائیں۔ یہی تبدیلی مظلومیت کو کمزوری سے نکال کر طاقت میں بدلتی ہے، اور یہی فرق تحریک کو اخلاقی دعوے سے حقیقی قوت کی طرف لے جاتا ہے۔

طویل جدوجہد کی نفسیات: صبر، تھکن اور نسلی تسلسل

آزادی کی جدوجہد عموماً فوری نتائج کی نفسیات سے ٹکرا جاتی ہے۔ انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ اس کی قربانی کا ثمر اس کی زندگی میں نظر آئے۔ جب یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو تھکن، بے دلی اور مایوسی جنم لیتی ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ کیفیت اس وقت زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے جب انسان اپنی محنت کو نتیجے سے مشروط کر دیتا ہے۔ نتیجہ تاخیر کا شکار ہو تو محنت بے معنی محسوس ہونے لگتی ہے۔

انقلابی جدوجہد میں یہ فریب عام ہے کہ کامیابی ایک واضح لمحہ ہو گی، اور اس لمحے تک پہنچنا ہی اصل مقصد ہے۔ اس فریب کے تحت انسان اپنی قدر کو فتح کے قریب یا دور ہونے سے ناپنے لگتا ہے۔ یہی پیمانہ طویل جدوجہد میں سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو اس کے حقیقی

کردار سے کاٹ دیتا ہے۔ وہ خود کو ایک سلسلے کی کڑی کے بجائے ایک ناکام یا کامیاب فرد کے طور پر دیکھنے لگتا ہے۔

طویل جدوجہد کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی توقعات کو نتائج سے ہٹا کر تسلسل سے جوڑے۔ صبر یہاں انتظار کا نام نہیں، بلکہ مستقل نظم، ضبط اور خاموش عمل کا نام ہے۔ جو انسان ہر دن کو فیصلہ کن دن سمجھ کر جیتا ہے، وہ جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ جو خود کو ایک لمبے سفر کا حصہ سمجھتا ہے، وہ تھکن کے باوجود چلتا رہتا ہے۔ انسان یہ مان لیتا ہے کہ اس کی زندگی کا معنی صرف اس میں نہیں کہ وہ کیا حاصل کرتا ہے، بلکہ اس میں بھی ہے کہ وہ کس جدوجہد کو زندہ رکھتا ہے۔ جب یہ شعور پیدا ہو جائے تو قربانی ناکامی نہیں لگتی، اور خاموش محنت ضیاع محسوس نہیں ہوتی۔

اسی حقیقت کو البیر کامیو نے «متھ آف سسیفس» کے ذریعے یوں بیان کیا تھا کہ «خود جدوجہد ہی انسان کے دل کو بھر دینے کیلئے کافی ہوتی ہے۔» یعنی کہ معنی ہمیشہ انجام میں نہیں ہوتا، اکثر وہ عمل میں چھپا ہوتا ہے۔ انقلابی انسان اسی لیئے خود کو فتح کے لمحے سے نہیں، جدوجہد کے تسلسل سے جوڑتا ہے۔

نسلی تسلسل کا شعور انسان کو خود پرستی سے نکالتا ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتا کہ تاریخ اسے کیا دے گی، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ تاریخ میں کیا چھوڑ کر جائے گا۔ یہی شعور تھکن کو برداشت میں بدلتا ہے، صبر کو وقار بخشتا ہے، اور جدوجہد کو

وقتی کامیابیوں سے آزاد کر دیتا ہے۔

طویل جدوجہد میں سب سے بڑی شکست یہ نہیں کہ انسان انجام نہ دیکھ پائے، بلکہ یہ ہے کہ وہ راستے میں معنیٰ کھو دے۔ اور سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ معنیٰ کے ساتھ چلتا رہے۔

اختیار، اطاعت اور شعوری نظم

انقلابی تنظیم میں اختیار اور اطاعت کوئی بیرونی بندوبست نہیں ہوتے۔ یہ وہ داخلی کیفیت ہوتی ہے جس میں انسان اپنی ذات کو بچانے کے بجائے معنی کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہاں اطاعت اس لیئے نہیں کی جاتی کہ حکم آیا ہے، بلکہ اس لیئے کہ فرد جانتا ہے وہ حکم ایک ایسی تاریخ کے اندر رکھا گیا ہے جس کا بوجھ کسی ایک انسان کے کندھوں پر نہیں ڈالا جا سکتا۔

جہاں اطاعت صرف عمل بن جائے، وہاں انسان اندر سے خالی ہو جاتا ہے۔ اور جہاں اختیار سوال سے ماورا سمجھا جائے، وہاں تنظیم اپنے ہی سائے سے ڈرنے لگتی ہے۔ انقلابی نظم ان دونوں انتہاؤں کو رد کرتی ہے۔ یہاں نہ اطاعت عقل کی نفی ہے، نہ اختیار انا کی توسیع۔ یہاں نظم ایک ایسی حالت ہے جس میں فرد اپنی آزادی ترک نہیں کرتا، بلکہ اسے از سرِ نو معنی دیتا ہے۔

شعوری نظم اس لمحے پیدا ہوتی ہے جب انسان یہ مان لیتا ہے کہ اس کا فیصلہ

اب صرف اس کا ذاتی معاملہ نہیں رہا۔ وہ جو کرتا ہے، وہ صرف اس کے بارے میں نہیں بولتا بلکہ پوری تحریک کے بارے میں بولتا ہے۔ یہی احساس اطاعت کو اخلاقی بناتا ہے، اور اختیار کو ذمہ دار۔ یہاں حکم ماننا اطاعت نہیں، بلکہ شراکت ہوتی ہے۔ اور حکم دینا اقتدار نہیں، بلکہ جوابدہی ہوتی ہے۔

سیاسی فلسفہ ہمیں بار بار یہ یاد دلاتا ہے کہ اقتدار اس وقت قائم نہیں رہتا جب وہ اطاعت مانگے، بلکہ اس وقت قائم رہتا ہے جب لوگ اس میں خود کو پہچاننے لگیں۔ اسی نکتے کو ہنّا آرینڈٹ نے طاقت اور اطاعت کے تعلق پر بات کرتے ہوئے اس طرح سمجھایا تھا کہ « طاقت وہاں جنم لیتی ہے جہاں لوگ مل کر عمل کرتے ہیں، نہ کہ صرف حکم مانتے ہیں۔ » اس تصور میں نظم جبر نہیں رہتی، بلکہ مشترکہ شعور کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

انقلابی تنظیم میں نظم کا اصل امتحان خاموشی میں ہوتا ہے۔ وہاں جہاں کوئی نعرہ نہیں، کوئی تماشہ نہیں، اور کوئی تعریف نہیں۔ وہاں انسان یہ طے کرتا ہے کہ وہ حکم کو اپنی سہولت کے مطابق نہیں پرکھے گا، بلکہ تحریک کی ضرورت کے مطابق سمجھے گا۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں اطاعت خوف سے نکل کر وقار میں بدلتی ہے۔

جہاں نظم شعور سے کٹ جائے، وہاں تنظیم ہجوم بن جاتی ہے۔ اور جہاں نظم شعور سے جڑی رہے، وہاں خاموشی بھی ایک سیاسی عمل بن جاتی ہے۔ یہی

شعوری نظم انقلابی جدوجہد کو وقتی جوش سے نکال کر ایک طویل، صابر اور باوقار راستے پر قائم رکھتی ہے۔

دشمن کو سمجھنے کی صلاحیت

دشمن کو صرف برا کہنا آسان ہے، مگر دشمن کو سمجھنا مشکل ہے۔ قومی آزادی کی جدوجہد میں سب سے خطرناک غلطی یہ ہوتی ہے کہ ایک انقلابی انسان دشمن کو ایک خیالی دیو سمجھ لے، اور خود کو محض ایک زخمی ردعمل۔ اس فہم میں نفرت تو پیدا ہوتی ہے، مگر حکمت نہیں بنتی۔ اور حکمت کے بغیر نفرت انسان کو طاقت نہیں دیتی، اسے جلد بازی دیتی ہے۔ دشمن کا نظام صرف بندوق سے نہیں چلتا، وہ زبان سے چلتا ہے، خوف سے چلتا ہے، اور اسی نفسیاتی ترتیب سے چلتا ہے جو انسان کو فیصلہ کرنے سے پہلے خود پر شک میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جو انقلابی انسان دشمن کو صرف "ظالم" کے نام سے پہچانتا ہے، وہ دشمن کے طریقہ کار، کمزوریوں، ترجیحات اور نفسیاتی حربوں کو نہیں دیکھ پاتا۔ پھر وہ وہیں لڑتا ہے جہاں دشمن چاہتا ہے، اور اسی وقت پر ردعمل دیتا ہے جب دشمن چاہتا ہے۔

نفسیاتی طور پر دشمن کو سمجھنا نفرت کی کمی نہیں، بلکہ نفرت کو شعور میں بدلنے کا عمل ہے۔ جب انقلابی انسان دشمن کے ذہن کو پڑھنا سیکھتا ہے تو وہ اپنی جذباتی توانائی کو نظم میں رکھتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ دشمن کب دباؤ بڑھاتا ہے، کب خاموش رہ کر تھکاتا ہے، کب افواہ اور بے یقینی سے صفوں میں بدگمانی پیدا کرتا ہے، اور کب اخلاقی زبان کے ذریعے مزاحمت کو جرم بنا کر پیش کرتا ہے۔ دشمن کی اصل چال یہ ہوتی ہے کہ وہ آزادی کے ایک سپاہی کو مشتعل رکھے، تاکہ وہ سوچنے کے قابل نہ رہے۔ اور جب انسان سوچنے کے قابل نہ رہے تو وہ اپنے ہی فیصلوں سے اپنی کمزوری پیدا کر لیتا ہے۔

دشمن کو سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک انقلابی انسان اس جنگ کو محض غصے کی سطح پر نہیں، معنی کی سطح پر لڑے۔ جہاں سوال یہ نہ ہو کہ دشمن کتنا بد ہے، بلکہ سوال یہ ہو کہ دشمن کا نظام کیسے چلتا ہے، اور ہم اسے کہاں سے توڑ سکتے ہیں۔ یہی صلاحیت جدوجہد کو ردعمل سے نکال کر حکمت میں داخل کرتی ہے۔

زندگی اور موت کے اختیار کی تنظیم کو حوالگی

جب کوئی انسان مسلح انقلابی جدوجہد میں شعوری طور پر داخل ہوتا ہے تو وہ صرف اپنا وقت، اپنی محنت یا اپنی مہارت پیش نہیں کرتا۔ وہ ایک زیادہ گہرا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ یہ مان لیتا ہے کہ اب زندہ رہنے اور مرنے کا اختیار اس کی ذات کا خالص ذاتی معاملہ نہیں رہا۔ اس لمحے کے بعد زندگی بھی تنظیمی امانت بن جاتی ہے، اور موت بھی ایک اجتماعی سوال۔

یہ نکتہ رومانوی نہیں، بلکہ بے رحم حد تک سنجیدہ ہے۔ انقلابی تنظیم میں شامل ہونے کے بعد کوئی فرد یہ حق محفوظ نہیں رکھتا کہ وہ اپنی جان کو جب چاہے خطرے میں ڈال دے، یا اپنی موت کو اپنی بہادری کا ثبوت بنا لے۔ بے وقت مر جانا اکثر قربانی نہیں ہوتا، بلکہ انا، جلد بازی یا سیاسی ناپختگی کی علامت بن جاتا ہے۔ کیونکہ جدوجہد میں موت کا معنی اس کی شدت میں نہیں، اس کے

محل و موقع میں ہوتا ہے۔

انقلابی انسان اس حقیقت کو قبول کرتا ہے کہ اب اس کی جان صرف اس کی نہیں رہی۔ وہ زندہ رہتا ہے تو بھی تحریک کیلیئے، اور اگر مرنا پڑے تو بھی تحریک کے فیصلے کے تحت۔ وہ یہ نہیں پوچھتا کہ میں کب تیار ہوں، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ تحریک کا وقت کیا تقاضہ کرتا ہے۔ یہی فرق ذاتی شجاعت اور سیاسی شعور کے درمیان لکیر کھینچتا ہے۔

سیاسی فلسفہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اجتماعی جدوجہد میں سب سے بڑا فریب یہ ہوتا ہے کہ فرد خود کو تاریخ کا مرکز سمجھنے لگے۔ حالانکہ تاریخ افراد کو نہیں، عمل کے تسلسل کو محفوظ رکھتی ہے۔ اسی لیئے انقلابی تنظیم میں زندگی کو بچانا بھی اتنا ہی انقلابی عمل ہو سکتا ہے جتنا جان دینا۔ جو کارکن ہر لمحہ مرنے کو تیار ہو، مگر جینے کی ذمہ داری نہ سمجھے، وہ جدوجہد کو کمزور کرتا ہے، مضبوط نہیں۔

یہاں نظم محض حفاظتی تدبیر نہیں رہتی، بلکہ اخلاقی اصول بن جاتی ہے۔ تنظیم فرد کو یہ یاد دلاتی ہے کہ اس کی جان ایک وسیلہ ہے، اور وسیلہ کبھی جذبات کے سپرد نہیں کیا جاتا۔ زندگی کو محفوظ رکھنا بزدلی نہیں، اور موت کو موخر کرنا پسپائی نہیں۔ اصل بزدلی یہ ہے کہ انسان اپنی جان کو اجتماعی حکمت سے باہر لے جائے۔

اسی شعور کو انتونیو گرامشی کے اس خیال میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ

« جدوجہد میں فرد کی قربانی اسی وقت معنی رکھتی ہے جب وہ ایک تاریخی منطق کا حصہ ہو، محض ذاتی جذبے کا اظہار نہ ہو۔ »

انقلابی انسان اپنی موت کا مالک نہیں رہتا، مگر بے اختیار بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جان کو ایک ایسے وقت کے سپرد کرتا ہے جو اس سے بڑا ہوتا ہے۔ یہی حوالگی اسے خودکشی کے رومان سے نکال کر سیاسی وقار میں داخل کرتی ہے۔

حرفِ آخر

یہ کتاب یہاں ختم نہیں ہوتی۔ یہ صرف کاغذ پر بند ہوتی ہے۔ اس کا اصل آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں سنگت اسے بند کر کے اپنے اندر جھانکتا ہے۔ جو کچھ یہاں لکھا گیا ہے وہ کسی آخری سچ کا دعویٰ نہیں، بلکہ ایک مسلسل سوال ہے۔ ایسا سوال جو ہر دور میں، ہر مرحلے پر، اور ہر ذمہ داری کے ساتھ نئے سرے سے پوچھا جانا چاہیئے۔

قومی آزادی کی جدوجہد میں سب سے خطرناک لمحہ وہ نہیں ہوتا جب دشمن طاقتور ہو، بلکہ وہ ہوتا ہے جب تحریک خود کو مکمل سمجھنے لگتی ہے۔ جب سوال رک جائیں، جب خود تنقیدی بوجھ بن جائے، اور جب نظم صرف اطاعت میں بدل جائے۔ یہ کتاب اسی خطرے کے خلاف ایک خاموش یاد دہانی ہے کہ جدوجہد کا اصل تقاضہ مسلسل شعور ہے، مستقل حرکت نہیں۔

یہاں بیان کیئے گئے نکات کسی مقدس متن کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان پر

اختلاف ممکن ہے، ان پر بحث ضروری ہے، اور ان پر عمل یکساں نہیں ہو گا۔ مگر ایک بات پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کہ سنگت خود کو محض حکم کا نفاذ کرنے والا وجود نہ سمجھے، بلکہ ایک ایسا انسان سمجھے جو سوچتا ہے، پرکھتا ہے، اور اپنی ذمہ داری کو سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ یہی فرق تنظیم کو ہجوم سے، اور تحریک کو ردِ عمل سے الگ کرتا ہے۔

اگر اس کتاب نے کسی سنگت کو لمحہ بھر کیلئے رکنے پر مجبور کیا، اگر کسی نے اپنے رویئے، اپنی عادت یا اپنی ترجیح پر خاموشی سے نظرِ ثانی کی، تو یہی اس کا حاصل ہے۔ جدوجہد کا معیار یہ نہیں کہ سب ایک جیسے ہو جائیں، بلکہ یہ ہے کہ سب ذمہ دار ہو جائیں۔ ذمہ دار اپنے عمل کے، اپنے اثر کے، اور اپنے چھوڑے ہوئے نشان کے۔

یاد رکھو، تاریخ ہمیشہ نعروں کو نہیں سنبھالتی، وہ انسانوں کو یاد رکھتی ہے۔ وہ انسان جو شور کے بغیر کام کرتے ہیں، جو شہرت کے بغیر نبھاتے ہیں، اور جو انجام کے بغیر بھی راستہ نہیں چھوڑتے۔ اگر یہ کتاب ایسے انسان پیدا کرنے میں ایک معمولی سا کردار بھی ادا کر سکے، تو یہی اس کی کامیابی ہے۔



جدوجہد میں شامل ہر سنگت اپنے ساتھ ایک سماج اٹھا کر لاتا ہے۔اس سماج کی زبان،اس کی عادتیں،اس کے تعصبات اوراس کی کمزوریاں بھی ساتھ آتی ہیں۔

آزادی کا عمل انہی باقیات کو توڑنے کا نام ہے۔

یہ کتاب سنگتوں سے قربانی کا مطالبہ نہیں کرتی۔قربانی یہاں پہلے ہی موجود ہے۔یہ کتاب وضاحت کا مطالبہ کرتی ہے۔وضاحت اپنی ترجیحات کی،اپنی کمزوریوں کی، اوراپنے کردار کی۔یہاں کوئی ہیرو نہیں گھڑے جارہے، کیونکہ تحریکیں ہیروز سے نہیں، کردار سے زندہ رہتی ہیں۔اور کردار نظم، ضبط اور خوداحتسابی سے بنتا ہے۔





ہکل پبلیکیشنز